تہذیب، خاندان اور معاشرہ

پروفیسر خورشید احمد

میں آپ تمام شرکا کو اس ورکشاپ میں خوش آمدید کہتا ہوں ٥۔ ۱۹۷۹ء میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے روزِ قیام ہی سے ہمارا مقصود رہا ہے کہ قومی اور ملی سطح پر پالیسیوں کا تجزیہ کرنے کا کام علمی دیانت، رواداری اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کے جذبے سے انجام دیں۔

ہمارا مقصد مسائل و معاملات کو سمجھنا، اور تجزیہ کر کے ان پر متبادل اور زیادہ متوازن راستوں کی نشان دہی کرنا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پالیسی سازی کا کام محض حکومت اور حکمرانوں کے دائرے تک محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس میں قومی مشاورتی سوچ کی شمولیت بھی ضروری ہے۔ اس لیے ہم نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ مختلف سیاسی، فکری اور دینی رجحانات کے حامل اصحابِ فکر ونظر کو دعوت دیں، اور وہ اپنے مؤقف پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے سے مکالمہ (dialogue) کریں۔ مکالمہ نام ہی ایک دوسرے سے بات کرنے، ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچانے کا ہے۔ مکالمے سے سوچ کی راہیں نکلتی ہیں، اختلاف کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور رواداری پیدا ہوتی ہے۔ اگر مکالمہ نہ ہو تو پھر لوگ صرف خود کلامی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور محض خود کلامی معاشرے کے بگاڑ کو تعمیر کے راستوں پر گامزن نہیں کر سکتی۔

---

٥ سیمینار کے کلیدی خطاب سے ماخوذ

بلاشبہہ ہمیں اپنے ماضی کی علمی روایت اور اس کی نعمتوں کا اعتراف ہے، اور بجا طور پر ہم اسلاف کی شاندار خدمات پر تشکر کے جذبات کے ساتھ فخر کے احساسات بھی رکھتے ہیں: الحمدلله علیٰ ذالک ۔لیکن اس کے ساتھ اپنے زمانے کے حالات اور مسائل کا ادراک اور مستقبل کی تعمیر کے لیے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کی کوشش وقت کی بڑی ضرورت اور ہمارے اسلاف ہی کی روایت ہے۔

اللہ سے تعلق کی بنیاد پر ہمیں اپنے باہمی تعلقاتِ کار کو درست کرنا ہے۔ تاہم ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا معاملہ صرف اسلام کی تقدیس بیان کرنے تک محدود نہیں ہے۔ ان اعلیٰ اقدار کی تعمیر و تشکیل کے لیے اسلام نے عبادت، عدل، احسان اور ادائے حقوق کا نظام دیا ہے، اور یہ حقوق بنیادی طور پر دو ہیں: سب سے پہلے اللہ کا حق ہے کہ ہم اپنی آزاد مرضی سے اپنے مالک کو پہچانیں اور پھر اللہ کے بندوں کے حقوق ہیں، جن کی ادائیگی سے زندگی خیر اور سکون سے بھر جاتی ہے اور آخرت کی کامیابی کے لیے بھی یہ زادِ راہ ہے۔

میں یہاں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتایا کہ میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو قرآن سے یہ ثابت ہے کہ فرشتوں نے دو باتیں کیں:

اوّل: نَحْنُ نُسَبِّحُکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ (سورہ البقرہ ۲:۳۰)، یعنی ہم تیری تقدیس بیان کرتے ہیں، تیرا ذکر شب و روز کرتے ہیں، پھر کیا ضرورت ہے۔

دوم: اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا (سورہ البقرہ ۲:۳۰)، یعنی اے مالک تو ایک ایسی مخلوق بنانے والا ہے جو زمین پر فساد پیدا کرے گی۔

یہ فساد کیا چیز ہے؟ حق کو ادا نہ کرنے اور حق سے انحراف کا نام فساد ہے۔ حق جوڑتا ہے اور فساد پھاڑتا ہے۔ حق انصاف کی طرف لے جاتا ہے اور فساد ظلم کی طرف۔ اور فرشتوں نے یہ محسوس کیا کہ جس نئی مخلوق کو آزادی عطا کی جارہی ہے، اور وہ اپنی مرضی سے اس کا استعمال کرے گا تو پھر یہ جہاں اطاعت کرے گا، وہاں بغاوت بھی کرے گا اور جہاں بغاوت ہوگی وہاں فساد بھی پیدا ہو

گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جواب دیا: اِنِّیْ اَعْلَمُ وَمَا لَا تَعْلَمُوْنَ (سورہ البقرہ ۲:۳۰)، یعنی تم نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں اور یہ کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیس، اللہ کا ذکر، بلاشبہہ فرشتے کر رہے تھے اور کرتے رہیں گے اور یہ ذکر اور اعلان و اظہار تقدیس انسانوں پر بھی لازم ہے، لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس میں حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق انسانی بھی۔ اللہ کے حقوق، اور انسانوں یا ذی روح اشیا کے حقوق ادا کرنے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں۔ یہ مساوات ہونے کے باوجود عملی سطح پر عورتوں اور مردوں کے درمیان ذمہ داریوں میں فرق اور تنوع (functional diversity) تو ہے، لیکن انسانی سطح پر اختلاف اور عدم مساوات (human diversity) نہیں ہے۔ کائنات کی تمام مخلوق اور انسانوں کے درمیان اس فرق کے حوالہ سے اصل سوال یہ ہے کہ کون اپنی ذمہ داری کس طرح ادا کر رہا ہے؟

پوری اسلامی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں چھے چیزیں اسلامی معاشرت کا ستون نظر آتی ہیں۔ تعمیر و ترقی اور تنزل اور انتشار دونوں کو سمجھنے کے لیے ان کا تاریخی کردار ہے۔ میں آسانی کے لیے یہ عرض کروں گا کہ ان میں چار میم (م) سے، اور دو قاف (ق) سے شروع ہوتی ہیں:

- پہلی چیز ہے **قرآن**۔ قرآن اپنے ماننے والوں اور اپنے انکار کرنے والوں کے درمیان فرق کرتا ہے اور اس مناسبت سے پوری انسانیت کی تقسیم منطقی ہے۔ منطقی اس لیے ہے کہ اس دائرے میں ہر کوئی داخل ہوسکتا ہے، چاہے اس کا تعلق کسی زبان، کسی علاقے، کسی وفاق اور کسی بھی قبیلے سے ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں قرآن واحد کتاب ہے جو انسان ساز، تہذیب ساز، اور تاریخ ساز ہے۔ آخری الہامی کتاب کی حیثیت سے پوری انسانیت کے لیے اس کتاب کا کردار بڑا مرکزی ہے۔ خیر اور شر میں تمیز، تہذیبوں میں تفریق، تاریخ میں نشیب و فراز، ان سب کو ہم قرآن کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔

⊙ اس کا دوسرا حصہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ قرآن، اللہ کی وہ ہدایت ہے جس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات کی حیثیت سے انسان کی فطرت اور حقیقت کو جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قرآن اسی وقت انسان کو بدلنے کا ذریعہ بنے گا، جب قرآن کے ساتھ انسانی زندگی کا ایک نمونہ اور ایک مثال بھی سامنے آئے گی۔ اس لیے ہدایت کے یہ دو سرچشمے: کتاب اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ دونوں مل کر ہدایت کی تکمیل کرتے ہیں اور ان میں تفریق تباہی کا راستہ ہے۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرآن کے ساتھ اس امت کی بنیاد، ترقی، صحت اور اس کے تشخص کے ضامن ہیں۔

مسلم امۃ میں عمودی اور افقی دونوں سمتوں میں وحدت اور یکسانی، انھی دو ذریعوں سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مسلمان دنیا میں کہیں بھی ہو، وہ کوئی جغرافیائی قوم نہیں ہے۔ کم ہوں یا زیادہ، دنیا کے ہر خطے، ہر علاقے اور ہر گوشے میں آپ کو مسلمان ملیں گے۔ ان میں یک رنگی و یگانگت کی بنیاد کس چیز پر ہوگی؟ صرف قرآن اور سنت رسولؐ پر۔ آپ کسی ملک کی زبان نہیں جانتے، لیکن جس لمحے آپ نے اذان سنی تو آپ کو فوراً معلوم ہو گیا کہ آپ کس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جس انسان نے آپ کو ''السلام علیکم'' کہا، آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ آپ کی تہذیب اور ملت کا حصہ ہے اور یہ تشخص صرف قرآن اور سنت سے پیدا ہوتا ہے۔

⊙ تیسری چیز ہے ماں۔ ماں، مسلمانوں کے پورے خاندانی نظام کا دل بھی ہے اور سرعنوان بھی۔ خاندان کا سربراہ چاہے شوہر ہو یا باپ اور دادا ہو، حقیقت یہ ہے کہ ماں ہی اس خاندانی نظام کا اصل محور ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اگر پوری اسلامی تاریخ میں قرآن و سنت نے اسلام، مسلمانوں اور مسلم تشخص کی حفاظت کی ہے تو اس کے بعد اس ضمن میں سب سے زیادہ جس ادارے نے کردار ادا کیا، وہ ہے خاندان۔ خاندان وہ واحد ادارہ ہے جو اللہ کا قائم کردہ ادارہ (divinely inspired) ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے سے منسلک دوسرے تمام ادارے انسان نے اپنے تجربات سے اور اپنی

ضرورتوں کے مطابق تشکیل دیے ہیں، مگر انسان کے بنائے ہوئے ان اداروں کے برعکس آدم وحوا کا رشتہ اوراس سے خاندان کے نظام کا قیام اللہ کی حکمت بالغہ کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مقدس ادارہ ہے، اور یہی ادارہ تہذیب کے قیام اور انسانیت کے تسلسل کو یقینی بناتا ہے۔ بلاشبہہ اس ادارے کے خدوخال کو نکھار انسانوں نے دیا ہے اور اس حد تک یہ ادارہ اپنی موجودہ عملی شکلوں میں انسانوں کا تشکیل کردہ ہے، جس کے اندر تعمیر و ترقی ہو رہی ہے، لیکن اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک مقدس ادارہ ہے جس کو بظاہر انسانوں نے آگے بڑھایا ہے، تاہم اس کے خمیر میں الٰہیاتی رہنمائی موجزن ہے، جسے بدقسمتی سے مغربی تہذیب ملیامیٹ کرنا چاہتی ہے۔

⊙ چوتھی چیز مدرسہ ہے۔ اور مدرسہ، تعلیم کے پورے نظام کا مرکزی عنوان ہے۔ تعلیم و تربیت، فکروفن کی ترقی اسی کا عملی اظہار ہے۔ جب میں فکروفن کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس میں فکر کے ساتھ ٹکنالوجی بھی پیش نظر ہوتی ہے۔ ایمان وایقان، تہذیب وشائستگی اور فہم وفراست کے ساتھ حکمت کے میدان میں علم، اپنا جوہر ٹکنالوجی اور تبدیلی کی صورت میں بھی پیش کرتا ہے۔ پہلی وحی جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی، اس پر غور کریں تو اس میں ساری باتیں مل جائیں گی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ o (سورہ العلق ۹۶:۱-۵)

ان آیات میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ پڑھو، اللہ کے نام سے یعنی اللہ کی معرفت، اللہ سے رشتہ جوڑنا۔ مالک سے انسان کا رشتہ ان کی پہلی منزل ہے۔ اس رشتے کے بغیر جو علم بھی ہے وہ نامکمل اور ناپختہ ہے، جس کی حیثیت محض خبر (information) کے گرد گھومنے تک محدود رہتی ہے اور وہ حکمت (wisdom) تک پہنچنے سے محروم رکھتا ہے۔ اِقْرَاْ کے بعد کہا گیا کہ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ o اس اللہ کے نام سے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

گویا کہ اللہ کی معرفت کے ساتھ دنیاوی امور کا علم ضروری ہے: یعنی خلق، طبعی حقائق، رشتے اور معاملات۔ اللہ سے رشتہ اگر نقطۂ آغاز اور اولیں محور ہے تو پھر اس کا دائرۂ عمل دنیا اور اس کے حقائق ہیں، جو طبعی علوم کی ترقی کا راستہ دکھاتے ہیں۔ طبعی دنیا (physical world) کے بعد ایک دوسرا دائرہ حیاتیات اور نباتات کا ہے، جس کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o علق پوری حیاتیاتی (biological) زندگی کا عنوان ہے، جو انسان کے جسمانی علم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور تمام حیاتیاتی علوم (Biological Sciences) اس کا مظہر ہیں۔ پھر الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (سورہ العلق ۹۶:۴) میں قلم کیا ہے؟ وہ سارے ذرائع جن سے یہ عمل آگے بڑھتا ہے جس کا اظہار میں ٹیکنالوجی کے نام لے کر کرتا ہوں۔ علم کی جولانیوں کے لیے یہی تین بڑے میدان ہیں، لیکن ان میں بھی آخر کار مرکزیت اللہ ہی کی ہونی چاہیے، اس لیے جس ادارے کو میں مدرسہ کہہ رہا ہوں، وہ علم کا ماخذ بھی ہے، اس کا اداراتی (institutional) اظہار بھی ہے اور خاندان کے بعد دوسرا سب سے اہم سماجی ادارہ بھی۔ پوری مسلم تاریخ میں مدرسے نے علم اور ٹکنالوجی کے فروغ میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ تاہم جب ہمارا مدرسے کا نظام بگڑ گیا تو علم اور ٹکنالوجی کا باہم تعلق باقی نہیں رہا۔ اس کے ساتھ ہی جب علم اور معرفت کا تعلق کمزور ہوا تو ہمارا زوال شروع ہو گیا۔

- پانچویں چیز ہے مسجد۔ مسجد اور مدرسے کا بڑا قریبی تعلق رہا ہے۔ ہماری تاریخ اور تہذیب میں مسجد اور مدرسہ کندھے سے کندھا ملائے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں مسجد، چرچ کی طرح محض عبادت کی جگہ نہیں ہے، بلکہ یہ علم کا مرکز ہے اور ملت کے اجتماعی امور کے طے کرنے کا بھی یہی محل ہے۔ مسلم تاریخ میں جامعاتی سطح کی تحقیق و تعلیم کا مرکز، مسجد اور اس سے ملحق عمارات رہی ہیں۔ مسجد سے علمی دنیا کا یہ الحاق، اللہ سے تعلق کو مضبوط بناتا اور زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتا ہے۔

⊙ چھٹی چیز ہے قوت اور قیادت۔ یہ دوسرا قاف (ق) ہے۔ یہ بھی اسلام کا امتیاز ہے کہ اس نے قوت اور قیادت کو بھی اس مثالی نمونے (paradigm) کا حصہ بنایا ہے۔ اسلام نے قوت کو علم اور عبادت سے بے نیاز نہیں کیا۔ اس لیے کہ جب قوت علم اور عبادت سے منقطع ہو جائے، کٹ جائے اور متعلق نہ رہے تو پھر وہ قوت ایک شیطانی آلے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسلام نے برملا کہا ہے کہ قوت ضروری ہے اور قوت کوئی بری چیز نہیں ہے۔ قوت کو قرآن نے انسانیت پر ایک احسان کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کا رشتہ انصاف سے جوڑا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (سورہ الحدید ۵۷: ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا (طاقت) اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قدرت والا اور زبردست ہے۔

نیز سورۃ الانفال میں مادی، عسکری اور ٹیکنالوجی کی قوت اور وہ بھی مسابقت (competative) کی قوت کے حصول کی تلقین اس طرح فرمائی:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ الانفال ۸: ۶۰)

اورتم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھوتا کہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اوران دوسرے اعداء کوخوف زدہ کردو جنھیں تم نہیں جانتے مگراللہ جانتا ہے۔اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمھاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

ان آیاتِ مبارکہ پر غور کریں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اول الذکر پانچوں کے ساتھ قوت کی تسخیر اور وہ بھی مقابلے کی قوت تا کہ حق اور اہل حق وسائل اور ذرائع کی کمزوری کی بنا پر مار نہ کھا جائیں۔اس لیے قوت کے حصول پر کسی طرح کی معذرت یا جھجک کی ضرورت نہیں ہے۔یہ کوئی محض سیاست کا کھیل بھی نہیں ہے۔یہ ہمارے نقطۂ نظر اور روایتی مذہبی تصور کے درمیان ایک امتیاز ہے۔جن لوگوں نے چشم ہوش سے قرآن عظیم اور سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ مکہ میں دعوت دین پیش کرنے والے رسول اللہؐ، مدینہ پہنچے تو ایک منتظم ریاست کی صورت میں دین حق کے گواہ بن کر سامنے آئے۔روایتی مذہبی مقتدرہ کے نزدیک ریاست کی زمام کار سنبھالنا غیر مذہبی کام ہے، بلکہ شاید تقویٰ کی راہ سے انحراف ہے۔جبکہ اسلام اس کو انحراف نہیں کہتا، بلکہ وہ اسے انسانی تہذیب و معاشرت کا فطری تقاضا قرار دیتا ہے۔علم اور عبادت کے ساتھ تسخیر کائنات اور قوت اور قیادت کی یہ دونوں لہریں مل کر ہی انسانیت کے لیے خیر کا باعث بن سکتی ہیں اور یہ کام قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔اس طرح قوت کے لیے ایمان، علم، ٹکنالوجی اور تنظیم بھی ضروری ہیں۔

یہ چھ بنیادی ستون ہیں اور انھی کے فریم ورک میں آپ اسلامی نظام اور تہذیب کے خدوخال دیکھ سکتے ہیں۔جب تک مسلمانوں نے ان اداروں کو قائم اور برقرار رکھا اور اس سلسلے میں کسی مصلحت یا مصالحت کا خیال نہیں کیا، وہ سربلند اور کامیاب رہے۔میں سمجھتا ہوں کہ آج کا دور مسلمانوں کے لیے زیادہ سخت دور اس لیے ہے کہ ہم نے ایمانی تقاضوں کے شعور سے بے رغبتی،

تہذیبی شعور سے لاتعلقی اور عملی جستجو سے پہلوتہی کا راستہ اختیار کرلیا ہے۔ بحران اور نشیب وفراز پہلے بھی رونما ہوئے ہیں، بغداد جلا اور تباہ بھی ہوا۔ منگولوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، لیکن پہلے ۱۲سو سال میں ایسا کبھی بھی نہیں ہوا کہ ہمارے یہ ادارے اضمحلال کا شکار ہوئے ہوں۔ چونکہ یہ ادارے باقی تھے، اس لیے اگر ایک جگہ ہم کمزور ہوئے تو دوسری جگہ قوت حاصل کرلی۔ لیکن یہ پہلی بار ہوا ہے کہ ہمارے ادارے بھی تباہ ہوئے اور قوت بھی ختم ہوگئی۔ اور جب آج قوت کے حصول کے لیے ہم کوشش کرتے ہیں تو مغرب ہمیں طرح طرح کے نام لے کر پکارتا ہے، کبھی ''پولیٹکل اسلام'' کہتا ہے، کبھی ''جنگ جو اسلام''، کبھی ''فنڈامنٹلسٹ اسلام''، اور اب تو کھل کر ''دہشت گرد اسلام'' کہتا ہے۔ اس صورت حال میں ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تاہم اصل سوال یہ ہے کہ مسلمان دوبارہ ایمان، تہذیب، علم اور قوت کی باگ ڈور پر اپنی گرفت بحال کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں؟ ہمیں اسی سوال کا جواب تلاش کرنا چاہیے۔

یہ ایک فکری، علمی اور عملی معرکہ ہے اور اس معرکے میں ہماری تین چیزیں کسی نہ کسی حیثیت میں ہمارے مخالفین کا ہدف رہی ہیں۔ وہ ہیں: قرآن، نبیؐ کی ذات اقدس، سنت رسولؐ، اس سے تعلق اور محبت کا رشتہ اور پھر ایک حد تک ماں اور خاندان۔ سچی بات یہ ہے کہ قرآن، رسولؐ، ماں، مسجد اور مدرسہ یہی ہمارا سرمایہ ہیں۔ خاندان کے موضوع پر غور کرنے کا میرے ذہن میں یہ فریم ورک ہے۔

مسلمان کے پاس تمام انسانوں کے لیے رحمت، اخوت اور عدل کا پیغام ہے۔ اللہ رب العالمین ہے، رب المشرقین ورب المغربین ہے۔ نبی کریمؐ، رحمت للعالمین ہیں اور وہ کسی ایک گروہ، کسی ایک قوم، یا کسی ایک علاقے کے نبی نہیں ہیں اور مسلم امت، امتِ وسط ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں گلوبلائزیشن سیدنا نوحؑ کے واقعے سے ہوا ہے۔ سارے ماہرین بشریات ذکر کرتے ہیں کہ دنیا بھر کے کسی علاقے میں کوئی قوم اور قبیلہ ایسا نہیں ہے، جس کی تاریخ میں ایک بڑے طوفان کا ذکر موجود نہ ہو۔ آج گلوبلائزیشن اور ٹکنالوجی، انسانیت کے

لیے ایک شر بنتی جارہی ہے، دوسری جانب مسلمانوں میں گلوبلائزیشن سے مطابقت پیدا کرنے کی بہت زیادہ صلاحیت ہے، مگراس کا معیار اسلامی تہذیب ہے نہ کہ مغربی تہذیب کی بھونڈی نقالی۔ آج مغربی تہذیب کی پشت پناہی کے لیے دانش ور، سائنس وٹکنالوجی، کلچر، اور سوسائٹی، معیشت، فوج، ملٹری پاوراور پھر سیاسی غلبہ یک جان ویکسو ہیں۔ یہ معاملہ کم ازکم پچھلے ڈھائی سو سال سے ہو رہاہے۔ اس لیے آج کے نظریاتی، فکری اور اخلاقی موضوعات پر غور وتدبر کرتے ہوئے ہمیں اس تاریخی اور عصری تناظر کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔

اگر ہم اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بحث ومکالمے میں صرف مغربی تہذیب کے فکری تناظر کوملحوظ رکھیں گے تو نتائج درست نہیں ہوں گے اور معاملہ الجھ کررہ جائے گا۔ اس طرح ہم اپنے ساتھ انصاف کریں گے، نہ مغربی تہذیب کے ساتھ۔ ان دوتہذیبوں کا وجود ایک حقیقت ہے اور ان کے مابین تعامل (interaction) بھی ایک حقیقت ہے، جس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں تہذیبوں نے ایک دوسرے سے اثرات قبول کیے اور ایک دوسرے کو متاثر بھی کیا، اس پہلو کو بھی ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں چوکنا رہنا چاہیے۔ اسلامی اخلاقیات، اسلامی اصولوں اور اسلامی احکام کو نظرانداز کرنے اور اسلامی احکامات اور امتیازات کی قطع وبرید کرنے کے لیے ان سامراجی قوتوں اور ان کے پروردہ مقامی حاکموں اور دانش وروں کی پیش قدمی کو قبول نہ کیا جائے۔ ایسا ہوا تو یہ بڑے خسارے کی بات ہوگی۔ دوسری جانب جہاں اہل مغرب کو اسلام کا مطالعہ اس کے حقیقی تناظر میں کرنا چاہیے، وہاں خود مسلمانوں کے لیے نہ صرف درست بلکہ مطلوب رویہ یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب اور اس کی اخلاقی اقدار کو سمجھیں، اس کی خوبیوں اور اس کی خامیوں اور کمزوریوں کو متعین کر کے آگے بڑھیں۔ جن امور کے بارے میں ان دونوں تہذیبوں میں کوئی تصادم نہیں ہے، وہاں کھلے دل سے انسانیت کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا ایک راست اور دانش مندانہ طرزِ عمل ہوگا۔ لیکن آنکھیں بند کر کے مغربی تہذیب کی نقالی اور اس کے ان پہلوؤں کو بھی بے سوچے سمجھے اختیار کرلینا، جو اسلام کی اقدار اور اساسی اصولوں سے متصادم ہیں

اور جو انسانیت کے لیے مضر اور تباہی کا باعث ہیں صرف نادانی ہی نہیں بلکہ صریحاً خودکشی کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو اخلاقی نظام عطا کیا ہے، اس کے تحت تعزیرات مدون کرنے کا اختیار انسانوں کو حاصل ہے۔ اسلامی 'حدود' دراصل، مقاصد شریعت کا تحفظ کرتی ہیں۔ مسلم معاشروں کی روایات، ضابطہ بندی، رسم و رواج اور قوانین کی تشکیل وارتقا اسی تناظر میں ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ دین اسلام کے مقاصد کو سمجھنا اور پھر ان کی روشنی میں بننے والے ضابطوں اور قوانین کا جائزہ لیتے رہنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ عصری تناظر کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں جوں کا توں رکھنے پر اصرار کرنا، یا پھر مغرب کی فکری یلغار سے مرعوب ہو کر اپنے قوانین کو مسترد کر دینا دانش مندی نہیں ہے، البتہ دینی اور سماجی شعور کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ہمیں ترجیحات متعین کرنی چاہییں اور قوانین و ضوابط پر نظر ثانی کا عمل نہایت ذمہ داری سے انجام دینا چاہیے۔

ہمارے اندر ایسی وسعت نظر ہونی چاہیے، جس کے تحت ہم یہ دیکھنے کی صلاحیت پیدا کریں کہ اگر مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر، مختلف ثقافتوں اور روایات کے درمیان تنوع پایا جاتا ہے، تو اسے ایک فطری صورتِ حال سمجھ کر خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔ خرابی وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب ایک ہی امت کے افراد کے درمیان معاملہ باہمی تکفیر تک جا پہنچتا ہے۔ ہمیں نہ کسی کی تکفیر کرنی ہے اور نہ انھیں کاٹ کر پرے پھینکنا ہے۔ دوسروں تک بات نہ پہنچنے کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں: پہلا یہ کہ ہم بہتر طریقے سے انھیں حق بات سمجھا نہیں سکتے اور دوسرا یہ کہ مواقع ہونے کے باوجود وہ سمجھ نہیں سکے۔ دونوں صورتوں میں ہمیں اپنی حکمت عملی کو مؤثر بنانا ہو گا۔ اور مکالمے کے ذریعے اصلاح اور تعمیر نو کا کام کرنا ہو گا۔

اس وقت فقط مسلمان عورت ہی مسائل اور استحصال کا شکار نہیں ہے، مسلمان مرد بھی ایسے ہی بحران سے دوچار ہے۔ مسلم معاشرے میں مغربی تہذیب کے اثرات نے ہماری بہت سی مثبت روایات کو تلپٹ کر دیا ہے، رہی سہی کسر مقامی ثقافتوں کے جاہلانہ رسم و رواج نے پوری کر دی ہے۔

یہ ایسی صورت حال ہے جس نے مسلم مرد اور عورت دونوں کو بڑی شدت سے متاثر کیا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ظلم یہ ہے کہ ہم نے اپنی علاقائی سماجی روایات اور رسم و رواج (customs) کو دین کا قائم مقام سمجھ لیا ہے۔ اس غلط فہمی نے بحران کو شدید تر کر دیا ہے، جس سے مسلم معاشرہ خرابی کا شکار ہو گیا ہے، اور مغربی تہذیب کی یلغار کو آگے بڑھنے میں مدد ملی ہے۔

مرد و زن کی مساوات کا جو تصور مغرب نے ہمیں دیا ہے، وہ حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا عطا کردہ عورت اور مرد کی مساوات کا تصور حقائق پر مبنی اور فطرت کا عکاس ہے۔ تاہم، آج کے مسلم معاشرے میں اسلامی تصورات کے مطابق عموماً مسلمان عورت سے انصاف نہیں ہو رہا۔ اس کی ذمہ داری مردوں پر بھی ہے، اور عورتیں بھی اس حد تک ذمہ دار ہیں کہ وہ خود اپنے حقوق سے ناواقف ہیں اور اپنے مقام سے آشنا نہیں ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ رسم و رواج کے نام پر مروجہ طور طریقوں سے عورتوں کو ان چیزوں سے محروم رکھا گیا ہے، جو اللہ نے ان کو دی تھیں۔ واضح رہے کہ اس حوالے سے اصلاح کا یہ کام کسی غصے یا ردِعمل کے ساتھ کرنے کا نہیں ہے۔ اس کام کے لیے اگر تخریب کا راستہ اختیار کیا جائے گا تو نقصانات زیادہ ہوں گے۔ لیکن نقصانات کے خطرے سے خائف ہو کر سرے سے مسئلے ہی کو نظر انداز کرنا، اور اس بگاڑ یا خرابیوں اور غلط روایات کو جاری رہنے دینا، ان کے خلاف آواز نہ اٹھانا یا ان کو تبدیل کرنے کی کوئی بامعنی کوشش نہ کرنا، یہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے۔ اس بگاڑ کی اصلاح کا چیلنج قبول کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ چیلنج بغاوت کے لیے نہیں، اصلاح کے لیے ہے۔ تخریب کے لیے نہیں، تعمیر کے لیے ہے اور اسی طریقے سے ہم اپنا اصل مقصد حاصل کر سکیں گے۔